"واقعی تم بہت فنی ہو۔" ڈمپل اٹھتے ہوئے بولی "سنو رشو! ایسے آدمی بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ تم بیچاری سیدھی ہو بچ کے رہنا۔"

"یہ کاشن تمہیں اپنے آپ کو بھی دینا چاہیئے تھا ڈمپل" رشو نے ہنس کر کہا۔

وہ تینوں جب سیڑھیوں تک پہنچے تو ریاض اپنی سیٹ خالی کر کے جا چکا تھا۔۔!

انوری کے جانے کے بعد خالہ فیروزہ پر اتنی بات بہت جلد کھل گئی کہ اب گھر کا بہت سارا کام ان کے کندھوں پر آپڑا ہے۔ پہلے چہرہ اکھ ہونٹ لٹکائے کھولنڈر بے گھسیٹتی تو پورے اتار دن میں وہ سنڈریلا گھر کا تمام کام کاج کرتی تھی۔ اب صفائیاں، کپڑوں کی استری، مہمانوں کی دیکھ ریکھ، بہت سارے غیر ضروری کام خالہ کو خود کرنے پڑتے۔ لیکن ایکسٹرا خالہ فیروزہ میں ضرور تھی۔ جب کوئی بہت بڑا سہارا زندگی سے نکل جاتا تو اس بیساکھی کے لئے آٹھ آٹھ آنسو رونے کی بجائے وہ زمین پر رینگتی ٹھوکریں کھاتی اس سہارے کو نو کروڑ صلواتیں سناتیں۔

انوری کے ہر کام میں اب کام چوری، بد دیانتی، اور پھوہڑپن صاف ظاہر تھا۔ نہ غسل خانوں کی بالٹیاں لوٹے صاف تھے نہ سائیڈ بورڈ کے شیشے چمکتے تھے۔ چائے کی پتی انوری کے زمانے میں زیادہ لگتی تھی۔ چینی کا خرچ بھی زیادہ تھا۔ دریوں کے نیچے سے بھری مٹی کی باریک تہہ برآمد ہوئی وہ بھی انوری کے کام چور ہونے کی پکی دلیل تھی۔

گودام میں گندم کی بوریاں چوہے کتر گئے۔ . . . انوری کا قصور۔

تیل کے چولہے کا دوسرا پیچ ڈھیلا تھا۔ . . . انوری مرتد۔

باورچی خانے کی نالی کے سامنے۔ سے جہاں غائب تھی۔۔۔۔ وہی قصور وار۔
بوا مدے کے گلے تلے مری ہوئی چھپکلی نکلی۔۔۔۔۔۔۔۔ مردار مرن جوگی۔
ڈرسینگ ٹیبل پر لپ سٹک اور کیوٹیکس کے داغ۔۔۔۔ سوائے اس کے اور
کسے کچھ کہیں۔
خالو بال کی عینک کا شیشہ ٹوٹا۔۔۔۔۔۔۔ اسی کے ہاتھ سے تو گری
تھی۔۔۔

غرضیکہ انوری کے خلاف ہر لمحہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بات شکایتاً کہی ضرور
جاتی۔۔۔۔ گو خالہ فیروزہ بظاہر نہ مانتی تھیں لیکن ہر لمحہ اسے یوں یاد کرنے کی رعایت
سے عیاں تھا کہ خالہ فیروزہ کی زندگی انوری کے جانے سے بہت دوبھر ہو گئی ہے۔
جب سے انوری گئی تھی خالہ پر سفاکی کا بھوت سوار تھا۔ وہ گھر والوں پر یہ ظاہر
کرنا چاہتی تھیں کہ انوری اس گھر میں اس قدر اہم نہیں تھی جس قدر سب لوگ سمجھے بیٹھے
ہیں۔۔۔۔ وہ اپنے آپ کو بھی یقین دلانا چاہتی تھیں کہ انوری کے بغیر بھی اس گھر
کا نظام اسی طرح چل سکتا ہے جیسے چلا کرتا تھا۔
انوری کے جانے کے پون ہی گھنٹے بعد پلنگوں کی نواڑیں ادھیڑی گئیں اور غلام
رسول کے ہاتھ دن ڈھلے شروس کے لئے قریبی ڈرائی کلینر کو بھیجی گئیں۔ پھر قالین دریوں
کی باری آئی۔ گھر کو آئینہ خانہ بنانے میں غلام رسول اور رمضان خالہ فیروزہ کے ساتھ گھر گئے
حتیٰ کہ ڈیوڈ کو بھی اندر بلا کر اس کی ڈیوٹیوں میں اضافہ کیا۔ پہلے انوری سارے گھر

کے بوٹ صاف کرتی تھی۔ اب صبح سویرے ڈیوڈ گربہ پائی سے گھر والوں کے بوٹ نکال کر کرسی پر بیٹھ کر پالش کرنے لگا۔ رمضان ایک تو زخم خوردہ تھا۔ دوسرے زیادہ شامت اسی کی آئی۔ گھر بھر کے فرنیچر کو اٹھانے دھرنے میں وہ بیدم ہو گیا۔ بھینس کے کمرے سے لے کر اگلی لان میں لگے ہوئے نلکے کے چپہ چپہ تک کو نا کو نا صفائی کے نرغے میں آ گیا۔ کچھ تو خالہ کو رشو جان کا کمرہ درکار تھا۔ وہ گودام میں سے کچھ چیزیں نکال کر ادھر رکھنا چاہتی تھیں کچھ ان پر صفائی کا بھوت بری طرح سوار تھا۔ غسلخانے کی سنک صاف کر کے باہر نکلیں تو سیدھی رشو کے کمرے میں پہنچیں۔ دیوار پر جالے دیکھ کر پہلے انہوں نے رمضان کو بلایا۔

"رمضان! بڑا سا ڈنڈا لے کر آؤ۔ جلدی! سامنے برش لگا دینا دیواریں صاف کرنے والا۔"

رمضان کے آنے تک انہوں نے کرسی پر چڑھ کر دیوار سے کانسی اور پیتل کے بھاری برتن اتارنے شروع کر دیئے۔ یہ سارے برتن ان کے جہیز کی یاد دلاتے تھے۔ جب یہ برتن ان کے لیے بہت قیمتی تھے۔ اب تو یہ گرد سے اٹے ہوئے ماضی کے ساتھ جوڑنے والی ایک کڑی کی حیثیت سے باقی تھے۔ ورنہ ان کا نہ کوئی کام باقی تھا نہ ہی ان کو بیچ ڈالنے کی ہمت تھی۔

رمضان جب آیا تو انہوں نے سارے کمرے کا سامان جو الماری میز کرسی اور بک شیلف کے علاوہ برتنوں پر مشتمل تھا۔ کمرے کے وسط میں اکٹھا کر رکھا تھا۔

چارپائی گھسیٹ کر کھڑکی کے سامنے کھڑی کی گئی تو دریا نے سائز کا سیاہ

ٹرنک جس پر گجرات کا تالا پڑا تھا پلیٹ فارم کے سامان کی طرح یکدم ننگا ہو گیا۔

"یہ چابیاں سنبھال لیجئے بیگم صاحبہ۔ تکیے تلے سے نکلی ہیں۔"

"کونسی چابیاں؟" خالہ نے ٹرنک پر نظریں جما کر پوچھا۔

"بی بی رشیدہ کے تکیے تلے سے۔ جی۔۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ لاؤ مجھے دو۔۔"

رشیدہ بس میں سوار ہوئی تو بس کا انجن گونجنے لگا۔

"آپ کو مجھ سے بالآخر محبت کرنا ہوگی۔ کرنا ہوگی اور ضرور کرنا ہوگی۔ میں پہلے گڑگڑاؤں گا پھر جھنجھوڑوں گا اور بالآخر تمہیں اغوا کر لوں گا۔"

آواز جلدی جلدی گیئر بدل رہی تھی۔ بریک لگا رہی تھی۔ کبھی بائیں موڑ کاٹ جاتی کبھی دائیں رخ پر مڑ جاتی۔ سرخ بتی پا کر چپ سادھ لیتی۔ اور سبز بتی دیکھ کر دھمکی دیتی ہوئی چلدیتی۔ یہ آواز پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے درختوں کے ساتھ، دوکان کی لمبی لمبی شفاف کھڑکیوں میں بس سٹاپ پر کھڑے ہر مرد عورت میں چھپ گئی تھی۔ اور ہر اوٹ سے جھانک جھانک کر اسے دیکھ رہی تھی۔۔ "میں تمہیں جھنجھوڑوں گا۔۔۔ جھنجھوڑوں گا۔۔۔ گڑگڑاؤں گا۔۔۔ اغوا کر لوں گا۔"

سپاہی ہاتھ دے دے کر ان انجانوں کو گذر جانے کی اجازت دے رہے تھے۔ کنڈکٹر نے جب روپے میں سے ساڑھے تیرہ آنے اسے واپس کئے تو ان پیسوں میں وہی کھنک تھی۔ اس پر جھک آنے والی عورت اور اسے اپنی گھڑی سے ٹھوکر

لگانے والی بڑھیا سب ایک ہی بات کہہ رہی تھیں۔ گڑگڑانے کی آواز، جھنجھوڑنے کا فعل گڑکے توار کی طرح لمبی تار میں بدلتا جا رہا تھا۔ اور اس تار میں وہ بندھی جا رہی تھی جب خالہ نے رمضان سے چابیاں لے کر رشو کے ٹرنک کا تالا کھولا تو محض تفریحاً کھولا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسے رنگین اور جان کے دیوان کی طرح دلچسپی سے الٹنے پلٹنے لگیں۔ جنسی لطیفوں کی طرح کسی کے ٹرنک کو اس کی غیر موجودگی میں جھنجھوڑنے کا بھی ایک خاص لطف تھا۔

پہلے ان کے ہاتھ رشیدہ کی ڈائری لگی۔ سبز جلد والی ڈائری جس نے اس سے کچھ نہ کہنے کا عہد کیا تھا۔ اور جو حرف بحرف سب کچھ اگلے جا رہی تھی۔۔۔۔ بد عہد مینا کی طرح۔۔ چندراوتی کا ایک ایک راز سندر کی تہہ سے نکل کر سفید پیٹ والی مردار مچھلی کی طرح پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔

خالہ فیروزہ نے ڈائری کے اوراق محض اس لئے الٹ پلٹ کئے تھے کہ ان سے وہ بہاولپوری اجڈ گنوار لڑکی کے خیالات پڑھنا چاہتی تھیں۔ اور یہاں بھان متی کا پٹارہ کھلا تھا۔

"یہ برتن واپس رکھ دوں جی۔۔؟" رمضان نے کانسی کے مجھوے صاف کر کے پوچھا۔۔۔

"ہاں رکھ دو دیوار گیر پر"

جب وہ جوں صفحے کھلتے جاتے تھے۔ ان پر اپنی حقیقت، اپنے گھر کی نفسیات

اور اس مکار عیار لڑکی کی تمام گھنی باتیں کھلتی جاتی تھیں۔ خالہ کبھی کرسی، کبھی سیڑھی اور کبھی کھڑکی کی سل پر بیٹھ کر ڈائری پڑھتی رہیں۔ اور جب ڈائری پڑھ چکیں تو پھر انہوں نے آدم بو آدم بو پکارتے ہوئے جن کی طرح سارے ٹرنکس کی تلاشی لی۔

مالِ غنیمت میں سب سے کارآمد چیز ٹافیوں کا وہ ڈبہ تھا جس میں نیلے خط اوپر تلے لکھے ہوئے تھے۔ اس ڈبے کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لیکر خالہ فیروزہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نہ انہوں نے سیاہ کمبل کو بند کرنے کی زحمت کی نہ کمرے کی چیزیں واپس رکھوائیں۔ رمضان نے بہت پوچھا کہ چارپائی کس رُخ بچھاؤں۔ بستر اچھاؤں کہ رہنے دوں لیکن خالہ بس اتنا کہہ کر چلی گئیں۔

"بس اب چارپائی بچھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کھڑی رہنے دو کھڑکی کے پاس"

سلسلۂ جلالیہ کا اصل چہل تنوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ وہ اصل یوں ہے کہ ایک صحابی روز بے اولادی کی شکایت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کرتے تھے۔ ایک روز حضورؐ نے جناب علی مرتضےٰ علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ تم ان کے حال پر متوجہ ہو۔ چنانچہ علی مرتضےٰ نے ایک تعویز لکھ کر ان کو دیا کہ اپنی اہلیہ کو گھول کر پلا دو۔ وہ یہ کلبی یہ تعویز لے کر گھر گئے اور اپنی بی بی کو تعویز دیکر حسب ارشاد کہا کہ لے اور گھول کر پی جا۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ بعد چندے کہ امیدواری نہ ہوئی تو وہ کلبی دوبارہ شکایت اس امر کی لیکر حضرت کی خدمت میں گئے۔ آپ نے پھر تعویز عنایت کیا۔ بی بی نے یہ تعویز بھی معطل رکھ چھوڑا۔ غرضیکہ اس طرح چالیس دفعہ چالیس

تعویز علی مرتضیٰ علیہ السلام نے مرحمت فرمائے اور حیران ہوئے کہ اسمائے الٰہی کی برکت کہاں گئی۔ بالآخر انہوں نے وہیر کلبی سے کہا کہ گھر میں جا کر بی بی سے پوچھو۔ ممکن ہے انہوں نے یہ تعویز استعمال نہ کئے ہوں۔ جب ان کو حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے گھر والی کو برا بھلا کہا۔ اس نے غصے میں آکر ایک ہی دفعہ میں وہ تمام تعویز کھول کر پی لئے۔ قدرت الٰہی سے جب حمل کا وقت پورا ہوا تو بچے کی جگہ ایک گٹھڑی سی نکلی۔ جب وہ کھولی گئی تو اکتالیس فرزند خورد خورد نکلے وہیر کلبی یہ ماجرا دیکھ کر از بسکہ پریشان ہوئے۔ ایک فرزند نکال لیا اور باقی چالیس تنوں کو ٹوکرا میں ڈال کر جنگل میں چھوڑ آئے۔ قدرت الٰہی سے ان کی حفاظت کے لئے ایک گنبد بے در وہاں آپ سے آپ بن گیا۔ اور یہ چالیس فقیر قبا و عبا سے آزاد عیاں پہننے لگے۔ اور بعد کو جب مدینہ میں وبا پھیلی تو وہ آنحضرتؐ کے ساتھ مدینے آئے۔ اور وحشیانہ اور مستانہ وار شہر میں رہنے لگے بعد مدت خلقت شہر تنگ ہوئی، اور بخدمتِ رسول اللہؐ تماش کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس میں تمہاری بہتری ہے لیکن لوگ نہ مانے، اور ان کے چلے جانے پر مصر ہوئے۔ وہ حسب الحکم نکل تو گئے لیکن رہنے میں پھر وبا پھوٹی۔ اب پھر لوگ حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور ملتجی ہوئے کہ ان چالیس درویشوں کو بلا دیجئے اور اس مصیبت سے نجات دلا دیجئے۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ تم جا کر ان کو لے آؤ۔ جب شیرِ خداؑ ان کے ساتھ شہر کو لوٹ رہے تھے تو ایک بکری صدر دروازے سے باہر جاتی نظر آئی۔ انہوں نے فرمایا یہی وبا ہے اسی کو پکڑ لو۔ . . . . . انہوں نے پکڑ لی اور ذبح کر کے کھا گئے۔ لیکن دم ایک کے ہاتھ میں رہ گئی۔

یہی وہ بقیہ مرض ہے جو ساری دنیا کو ستاتا ہے۔ اور اسی سے گھبرا کر اہل

اعتقاد چیل تنوں کی پناہ مانگتے ہیں۔ ہشت گوشہ دنیا میں ہر روز ایک گوشے میں ان کا پھیرا ہوتا ہے۔ فقرائے جلالیہ کہ اصل میں چیل تنوں کے پیروکاروں کا فرقہ ہے۔ ان لوگوں میں دستور ہے کہ بوقت بیعت طالب کے داہنے بازو پر سر لگاتے ہیں۔ اور طریق سر لگانے کا یہ ہے کہ ایک ٹکڑا کپڑے کا لیکر مرشد بدست خود پچھوا کرتا ہے اور پھر اس کو مدور کرکے ایک طرف آگ لگا بازو راست مرید پر رکھ دیتا ہے جب وہ پارچہ اسی جگہ پر رکھا ہوا جل کر خاکستر ہو جاتا ہے تو اوپر سے دبا کر اس کے اوپر برگ بیر رکھ دیتا ہے۔ پھر ہر روز تا اکیس یوم بطور مہر بازو پر لگا معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔

جب رشوبان کا لاٹرنک ٹانیوں کا ڈبہ۔ ورق ورق چھپی ہوئی ڈائری اور پرانا بستر لیکر ٹیکسی میں بیٹھی تو اس کے دل پر کپڑا جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ اب وہ برگ بیر کی تلاش میں ڈمپل کے گھر پہنچی۔ کیونکہ یہی ایک لڑکی ایسی تھی جس کے گھر اسے اکیس دن پناہ ملنے کی امید تھی۔ اپنا سامان ڈمپل کے برآمدے میں اتروا کر اس نے نیلا ڈبہ تھیلے میں ڈالا اور مال روڈ کی اس دوکان پر پہنچی جہاں بکلی کا سامان بکتا تھا۔

بیعت کرنے کی آخری رسم ابھی باقی تھی۔

غصے میں وہ سیڑھیاں پار کرکے اندر پہنچی تو اس کی نگاہ اظہر پر پڑ گئی۔ وہ کاؤنٹر کے پاس کھڑا کسی سیلز مین کو ہدایات دے رہا تھا۔

"جی۔۔۔ معاف کیجئے۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"مجھ سے؟۔۔۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔۔۔"

"پہچاننے کی کوئی ضرورت نہیں . . . آپ ظفر کے بھائی ہیں ناں؟"

"جی . . فرمائیے۔"

"مجھے آپ کے ابا جی سے ملنا ہے۔ ابھی اسی وقت . . . اسی لمحے . ."

"ابا جی سے . . ؟"

اظہر کے لب پر "رکھیں گے جی ابا جی سے ملاقات کسی دن نیو ایئر کے قریب" آیا اور رک گیا۔ لڑکی بہت طیش میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں چیلنج کی تیزی اور انگاروں کی دہک تھی۔

"ابا جی کا پتہ تو دے دیجئے . . . میرا منہ کیا دیکھ رہے ہیں آپ۔"

"شور . شور . . ضرور لیجئے پتہ . . ."

لڑکی پر کوئی آفتِ ناگہانی پڑی تھی۔ ورنہ وہ اتنی خوبصورت کیوں لگ رہی تھی . . نتھنے گلابی ہو کر بری طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔

"لیجئے! یہ ہے ہمارے گھر کا ایڈریس . . . . ڈیوس روڈ پر . . . اگر آپ میرا انتظار کریں تو میں آپ کو ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ اپنے گھر . . دوکان بند ہونے پر . .

"کب ہو گی بند آپ کی دوکان . . ."

گھڑی پر نگاہ جما کر اظہر بولا۔

"یہی کوئی سوا آٹھ بجے . . ."

"جی نہیں شکریہ . . . میں چلی جاؤں گی . ."

"ابا جی دیر سے آتے ہیں . ." اظہر منمنایا . .

"کوئی ہرج نہیں . . . میں انتظار کروں گی"

تیسری منزل پر آپا جی کے انتظار کا دوسرا گھنٹہ شروع تھا۔ اور وہ فی الحال یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ جن کو وہ بیر کا پتہ سمجھ کر اپنے زخم پر رکھنے آئی ہے ان کا نام کیا ہے؟

اس کمرے میں ہر طرف کتابوں کی الماریاں تھیں . . کمرے سے بند لائبریری کی بو آتی تھی . . یہ ایک ایسے شادی شدہ مرد کا کمرہ تھا جو ایک بار پھر مجرد زندگی گذار رہا ہو . . پلنگ کی چادریں قیمتی لیکن گندی تھیں۔ تکیے پر تیل کا داغ تھا۔ اور کمرے میں جا بجا سگریٹ بکھری ہوئی تھیں . . کتابیں جا بجا تھیں . . کچھ آراستہ کچھ بکھری ہوئی۔ کوئی اوندھی پڑی تھی اور کسی میں نشانی کے طور پر کاغذ پڑا تھا . . یہ ایک ایسے آدمی کا کمرہ تھا جو اپنے فرصت کے لمحات تمام تر کتابوں کی نذر کر دیتے ہیں . . مہاگنی کی لمبی میز پر چمڑے میں مڑھی کتابیں تھیں تکیے تلے پیپر بیک رنگین ٹائٹلوں والی کتابیں تھیں . . الماریوں میں کلاسیکی کتابیں تھیں جن کا کاغذ پتلا اور پرنٹ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ کھڑکی کی سل پر وہ کتابیں تھیں جن میں جا بجا آرٹ ورک تھا۔ اور بڑے حروف کی کتابت تھی . . غرضکہ یہ ایک سونے کا کمرہ کم اور مردہ کتابوں کا دفن زیادہ تھا . .

رشیدہ بید کی کرسی پر بیٹھ گئی . .

سامنے کی دیوار پر ظفر کے والد کی تصویر ٹنگی تھی۔ یہ تصویر تقریباً تیس برس پہلے کھینچی گئی ہوگی . . ظفر کی والدہ کرسی پر بیٹھی تھیں . یہ کرسی وارن ہیسٹنگز کے زمانے کی یادگار لگتی تھی اونچی پشت اور سیٹ دونوں بازوں پر مخمل سے کھنچی تھی۔ کرسی پر بیٹھنے والی ہندو عورتوں

کی طرح ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ بکل والی گرگابی پنجے پر پنجہ جمائے ہوئی تھی۔ جرابوں کا رنگ جوتی سے گہرا تھا۔ اور پھولدار ساڑھی اتنی اونچی تھی کہ بائیں پیر کا ٹخنہ صاف نظر آتا تھا۔ ساڑھی میں نہ سجاوٹ تھی نہ بانکپن۔ بس لپیٹا لپیٹی کی ہوئی تھی۔ بلاؤز پوری آستینوں کا اور ڈھیلا ڈھالا تھا۔ دائیں کندھے پر ساڑھی کے پلو سنبھالنے کے لئے ایک لمبا سا بروچ لگا ہوا تھا۔ ساڑھی کا پلا سر پر بھی تھا۔ اور سر کے بال مس مادھوری کی طرح کانوں کو چھپائے ہوئے تھے۔

لمحہ بھر کے لئے اس تصویر کو دیکھ کر رشیدہ نے سوچا۔۔۔ اللہ جانے یہ عورت زندہ ہے کہ مر گئی؟۔۔۔ اللہ جانے ظفر کی ماں زندہ ہے کہ وہ بن ماں کا اکیلا سارے جہاں میں پھر رہا ہے؟

تصویر کا نوجوان کھلے پائنچوں کی پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور اس کے عقب میں ایک بڑا شاداب پام کا پودا نظر آتا تھا۔ بالوں کو تیل سے جما کر دائیں ہاتھ کی مانگ نکال رکھی تھی۔۔۔ چہرے پہ احمق پن، ناکردہ کاری اور تھوڑا تھوڑا خوف طاری تھا جسے مسکراہٹ تلے چھپانے کی کوشش میں اس دولہے نے وارن ہیسٹنگز کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

کیا یہی ظفر کا باپ ہے؟

کیا اس کی بیوی مر چکی ہے؟

کیا اس گھر میں بھی ویسا ہی خلا ہے جیسا ان کے بہاولپوری مکان میں تھا؟

کیا یہ آدمی بھی اماں کی طرح اداس اور پریشان رہتا ہے؟ سوچتا ہے سوچتا ہے۔

اور جب آنسوؤں کے بہت قریب جا پہنچتا ہے تو پھر کتابوں میں پناہ لیتا ہے بالکل جس طرح اماں پاؤں والی مشین چلانے لگتی ہیں؟

امّاں کا چہرہ رشیدہ کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

کیا سادہ سادہ نقشہ تھا اماں کا حسن، بدصورتی کے درمیان بہنے والا ایک بے نام سا مانع کہ کبھی تو اس چہرے پر ملکوتی حسن کی پرچھائی پڑنے لگتی۔ اور کسی سی دن گالوں پر لپٹی ہوئی چھپکلی جیسی چھائیاں بہت زیادہ نمایاں ہو جاتیں۔ چہرہ سنولایا لگتا اور ناک کی بانسی ٹیڑھی نظر آتی۔

دراصل اماں کا حسن ان کے سوڑھیں پنہاں تھا۔ اماں ہنستی کھیلتی، مکئی کے دانے چباتی، مدھانی پھیرتی، مشین چلاتی، تولتے دھوتی، بستر بچھاتی، خوبصورت لگتی تھیں... نماز پڑھتی، ستون کے ساتھ کھڑی ہو کر سوچتی، لوٹا ہاتھ میں لئے زینے سے اترتی اماں بدصورت تھی۔ ایسے میں اماں کے چہرے پر وہ تمام فکر وہ تمام سوچیں ابھر آتیں جنہیں وہ اپنے آپ سے بھی چھپاتی تھیں۔

جب ابا جی فوت ہوئے اور اماں اندر اکیلی جا کر گندم کی بوریوں پر بیٹھ گئیں تو رشیدہ کو زندگی سے بڑے خوف آنے لگے۔ اماں نہ تو روتی تھیں نہ کسی سے بولتی تھیں۔ بس گندم کی بوری پر کھڑے زانو کئے بیٹھے پاؤں کے انگوٹھے سے بوری کریدے جاتی تھیں۔ جس جگہ اماں نے دائیں پیر کا انگوٹھا اس کریدنے کے لئے پھنسا رکھا تھا۔ وہاں سے بوری کچھ گھس گھس کر نرم ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر اس جگہ نے مزاحمت کی اور پھر یہاں سے دو دو چار چار

دانے گندم کے نکل نکل کر فرش پر گرنے لگے لیکن اماں تو کھڑے زانوؤں کے گرد دونوں بازو حمائل کئے چپ چپ گرم چادر اوڑھے بیٹھی تھیں

بڑی خالہ گئیں۔ ابا میاں کی بہت باتیں کی لیکن ایک آنسو ان کی آنکھ میں نہ آیا۔ شیخوں کی بہو نے بہت زور مارا لیکن اماں کھنائے ہوئے ابا جی کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ سارے گھر میں کافور، گیندے اور گلاب کے پھولوں کی مہک تھی۔ سارا آنگن عورتوں سے بھرا پڑا تھا، رہ رہ کر جب کوئی نئی عورت برقعہ اتارتی صحن میں داخل ہوتی تو ایک کہرام مچ جاتا۔

جنازہ اٹھنے سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے کی بات ہے کہ دروازے میں سے ایک عورت داخل ہوئی۔۔۔ نہ وہ لڑکی تھی نہ ہی اسے عورت کہا جا سکتا تھا۔ ان دونوں کیفیتوں کے درمیان الجھی ہوئی وہ دیوانہ وار اندر آئی۔۔۔ سارے صحن میں کوئی بھی اس کا واقف نہ تھا۔۔۔ سوائے ابا جی کے۔۔۔ اس نے سرخ شنیل کی شلوار پہن رکھی تھی، چہرے پر چیچک کے ایسے مدھم داغ تھے جو اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا حسن پیدا کر رہے تھے۔ سارا میک اپ آنسوؤں میں دھل چکا تھا۔ اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ہر آہ ہر چیخ میں اپنی جان کو گنڈاسے سے گنڈیریاں بنا بنا کر پھینک رہی ہے!

اس نے اپنا زرد برقعے کا نقاب الٹا اور آتے ہی چیخ کر بولی۔

"چلا گیا۔۔۔ چلا گیا۔۔۔ بے وفا؟"

ساری عورتوں میں سے صرف خالہ بی نے اٹھ کر رسماً اسے اپنے دائیں بائیں کندھے سے لگایا۔ لیکن اسے ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟

اس نے جھک کر کاؤز کے سلیٹی چہرے پر آنسوؤں کی وہ بارش کی کہ آباجی کے پپوٹے، گالیں اور نتھنے بھیگ گئے . . .

"ہمارا کون ہے؟ . . . ہمارا کون ہے؟ . . . ہمیں کس کے سپرد کئے جاتے ہو بابو جی! . . . بابو جی! ہمارا کون ہے؟ . . ."

وہ جھگلے سے ماتھا رگڑتے ہوئے بولی۔

"تمہاری بیوی کے تو بچے ہیں . . . کہاں ہیں ہمارے بابو جی کے بچے؟ . . . . . ارے کوئی مجھے ان کے بچے دکھلا دو . . . کوئی مجھے ان کے جگر گوشے تو ایک نظر دکھلا دو . . ."

رشیدہ، راشدہ، خالد اور نزہی کو خالہ نے اس کے قریب جانے کا اشارہ کیا . . . تو اس نے خالد کا چہرہ اپنے کھردرے ہاتھوں میں لے کر اونچے اونچے کہا۔

"وہی آنکھیں ہیں . . . وہی . . . ارے بے درد اس کو کس کے حوالے کر کے چلا؟ کون ان آنکھوں پر ترس کھائے گا . . . کون کون کون؟ تو تو بڑی محبت کرنے والا تھا . . . پھر تجھے کسی کی دعا بھی نہ لگی . . . کسی کی دعا نہ لگی تجھے، . . . ہم نے تو ساری ساری رات تیرے لئے دعائیں مانگی تھیں . . . اتنی بے اثر تھیں ہماری دعائیں . . . میں تو گناہ گار تھی - تیری سعیدہ کی دعائیں بھی نہ لگیں تجھے۔ کہاں ہے وہ سعیدہ جس کے گن گاتا تو تھکتا نہ تھا . . . کہاں ہے وہ جس کے لئے تو دن بھر سوچتا تھا . . . اسے بھی چھوڑ دیا ظالم . . . بے وفا!"

ساری عورتیں سکتے کے عالم میں اسکا چہرہ تکے جا رہی تھیں اور وہ اونچے اونچے بین کر رہی تھی۔۔ چھاتی پیٹ رہی تھی۔ جنگلے سے سر مار رہی تھی۔ عورتوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی تھی۔ سب اس کا حدود اربعہ پوچھ رہی تھیں۔

خالہ جمالی کہہ رہی تھیں۔

"تائب طوائف ہے۔۔ سنا ہے شہر سے باہر رہتی ہے۔"

پڑوسن بولی۔

"ہائے اللہ!۔۔۔ اس قدر بے شرمی! ٹھکیائی چاہے تائب ہو چاہے پیشہ کرائے رہتی بے شرم ہے۔"

"سندھن ہے۔۔۔ سنا ہے میاں نے چھوڑ دیا ہے۔ چھوٹا سا بچہ ہے۔ بازار میں حلوائی کی دکان کے اوپر چوبارہ لے رکھا ہے۔"

"نہیں جی۔ کراچی سے آئی ہے۔ خاندان کا اتہ پتہ نہیں۔ آوارہ عورت ہے۔"

جب عورت پر آوارگی کے تابڑ توڑ الزامات لگ چکے تو بالو جی کی باری آئی۔۔۔

سنا ہے اگر گوبر میں خمیری روٹیاں ڈال کر پورے چالیس دن کورے برتن میں رکھ کر اوپر سے باندھ دو تو عین اکتالیسویں دن اس میں بچھو پیدا ہو جائیں گے۔۔۔ کورا برتن ٹوٹ چکا تھا اور سارے صحن میں بچھو ڈنگ اٹھائے پھر رہے تھے۔۔۔

لیکن وہ عورت ان باتوں سے بے نیاز اپنی روح کی گندگیاں بنا بنا کر صحن میں پھینک رہی تھی۔۔۔ کبھی جنگلے پر جھک جاتی۔ کبھی خالہ کو چومنے لگتی۔۔ اس کے چہرے کا

ایک ایک پھٹتا کرب اور تشنج کی کیفیت ظاہر کر رہا تھا۔

"تیری ماں کہاں گئی؟ . . . کیا وہ بھی مر گئی . . ؟ مر گئی ہو گی . . . ہم سی سخت جان تو نہیں ہو گی کہ بابو جی سامنے پڑے ہیں اور ہم زندہ ہیں۔ اس کی سانس کی ڈوری تو سعیدہ سے بندھی تھی . . . کہو بابو جی! بندھی تھی ناں! . . . کہاں ہے وہ ارے کوئی بتاؤ تو کہاں ہے ان کی لاڈلی؟ کہاں ہے ان کی آنکھوں کا نور؟ . . . بجھ گیا ہو گا . . . آنکھیں نہ رہیں تو نور کہاں ہو گا . . . کس کے حوالے کر گیا اسے بے وفا . . ؟ تو تو کہتا تھا . . . میں سعیدہ سے قول ہار چکا ہوں ورنہ . . . اب کیا کیا یاد دلاؤں تجھے؟ . . . اس قول کا تجھے بڑا پاس تھا۔ کہاں گیا تیرا قول؟ . . . کہاں گئی تیری سعیدہ؟"

گندم کے دانے ہولے ہولے گر رہے تھے۔ آنسوؤں کی طرح بوجھل۔ پھر اماں جی اس آواز کو سن کر اٹھیں۔ لکڑی کی چوکاٹ کے ساتھ ان کے سوتے ہوئے پیر نے ٹھوکر جو کھائی تو انہوں نے دروازہ کا سہارا لیا۔ اور پھر باہر آگئیں۔

بابو جی جنگلے پر خاموش لیٹے تھے۔ وہ فریقین میں سے کسی کی جانب بھی نہ تھے۔ سرخ شنیل کی شلوار آگے بڑھی۔

سفید مرینہ کی چادر میں بغل مارے سعیدہ نے بازو آگے بڑھائے۔ اور اماں اونچی آواز میں اسقدر ڈھاڑیں مار مار کر روئیں کہ چیچک کے داغوں والی سہم گئی . . . اور جنگلے سے ہٹ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ماتم کی جگہ قرض مانگنے آگئی ہو۔

رشیدہ تصویر پر نظریں جمائے بیٹھی سوچ رہی تھی . . . اس دن کے متعلق جب ابا جی کی چارپائی گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ پھر وہ چیچک رُو نہ کبھی ان کے گھر آئی نہ ہی اس نے کبھی اُسے دیکھا . . . لیکن نہ جانے کیا بات تھی اس روز کے بعد اماں نے ابا جی کی بات کبھی نہ کی . . . لوگ ان سے ابا جی کی بات کرتے تو وہ خاموش آنسو بہائے جاتیں اور جب اکیلی ہوتیں اور ان کا گلا آنسوؤں سے بھر جاتا تو وہ مشین پر بیٹھ جاتیں اور ہولے ہولے پیڈل چلنے لگتے . . . رشیدہ نے کئی بار اماں سے ابا جی کا ذکر کرنا چاہا یا اس عورت کے متعلق پوچھنا چاہا۔ جو اس قدر دیوانہ وار آئی اور بن صدا کے چلی گئی لیکن اماں نے کبھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔

ایک رات جب اماں تہجد کی نماز پڑھ کر آ رہی تھیں اور صحن میں بلا کا حبس تھا تو رشیدہ نے ہاتھ بڑھا کر اماں کا پلّہ پکڑ لیا تھا۔

"اماں پانی پلا دیجئے ذرا . . ."

جب اماں سلور کے چمکتے کٹورے میں اس کے لئے پانی لائیں تو رشیدہ نے انہیں پاس بٹھا لیا تھا . . .

"اماں جی ! آپ . . . . آپ ابا جی کی کوئی بات نہیں کرتیں . . . آپ کو اچھے نہیں لگتے تھے ابا جی ؟"

اماں کی آنکھوں میں چھلا چھل آنسو آ گئے لیکن وہ خاموش رہیں . . .

"پھر اماں . . . . آپ . . . ہم سے ابا جی کی باتیں کیوں نہیں کرتیں . . ."

"کیا کریں ان کی باتیں؟ . . . اللہ جو کچھ کرتا ہے سمجھ سوچ کر کرتا ہے۔ اس میں بہتری ہوتی ہے انسان کی۔"

رشیدہ کا زخم بہت تازہ تھا۔ ایسی باتوں سے اس کی تشفی نہ ہو سکتی تھی۔

"کیا بہتری ہے اس میں کہ ابا جی . . . چلے گئے ہمارے بھلا؟ کیا بہتری ہے اس میں۔؟"

اماں نے خالی کٹورہ اٹھایا اور آہستہ سے بولیں۔

"بھرم رہ گیا سب کا . . . یہ کچھ کم بہتری نہیں ہے۔"

رشیدہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آگئی۔ اس نے تصویر پر سے نظریں اٹھائیں اور چق کی جانب دیکھنے لگی۔ معاً چق اٹھا کر ملک صاحب اندر داخل ہوئے۔ وہ گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی . . .

"بیٹھئے، بیٹھئے . . . مجھے اظہر نے بتایا تھا کہ کوئی مجھ سے ملنے گیا ہے گھر . . . زیادہ دیر انتظار تو نہیں کرنا پڑا آپ کو . . . بیٹھئے تشریف رکھئے۔"

"جی نہیں۔"

"فرمائیے۔ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں . . . اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو شاید . . . میں نے آپ کو چند دن ہوئے اظہر کی دوکان پر دیکھا تھا۔"

ٹافیوں والا ڈبہ اب ان کے سامنے پیش کرنے کی ہمت اور بھی کم ہو گئی۔

"فرمائیے . . . بلا تکلف کہئے۔"

وہ آنسو جو چند لمحے پہلے آنکھوں کے کونوں میں چھپے ہوتے تھے۔ گالوں پر رینگ آئے ہیں ہیں۔ آپ تو رو رہی ہیں۔ کیا ہوا۔۔؟ کیا ہوا؟

اس نے ٹائپوں کا ڈبہ میز پر پٹک کر بڑی رندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔

"یہ۔۔۔ یہ خط ہیں۔۔۔ خدا قسم میں نے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔۔۔ اور ان ہی خطوں کی وجہ سے مجھے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔۔۔ بے قصور۔۔۔ بلا وجہ۔۔۔"

لولی پاپ چوس لینے پر جیسے اکیلا ٹنڈ منڈ تنکا بیچ میں سے نکل آتا ہے۔ بالکل اسی طرح خالہ کے غصے نے وہ ساری محبت چوس لی تھی جو ان خطوں نے قطرہ قطرہ ٹپکائی تھی۔۔۔ اور اب فقط اکیلے تنکے کی طرح آوارگی کا وہ الزام باقی رہ گیا تھا جو خالہ نے اس پر لگایا تھا۔

ملک صاحب کی کار میں جب وہ واپس ڈیپل کے گھر لوٹی تو اسے پورا یقین تھا کہ اب ظفر اس کی زندگی سے مکمل طور پر نکل چکا ہے۔

ڈیپل کی دو منزلہ کوٹھی میسن روڈ پر ذرا اندر کی طرف تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں ڈیپل کے ابا اور اس کی تین چھوٹی بہنیں رہتی تھیں۔ اوپر کا حصہ کرائے پر تھا۔ اور وہ سب اسی کرائے پر گذر بسر کرتے تھے۔۔۔

چھ کنال کی اس کوٹھی میں جب عرفان صاحب آئے تو اس کوٹھی کے متعلق عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں۔ محلہ والے کہتے تھے کہ رات کے وقت کمروں میں سے رام نام ست کی صدائیں اٹھتی ہیں۔ اوپر والے ٹاور نما کمرے میں کوئی رہ رہ کر سنکھ پھونکتا ہے۔ اور پچھواڑے ٹیوب ویل کے پاس چٹ چٹ آگ جلتی ہے۔ اور کسی کی ارتھی اس بھڑکتی ہوئی آگ میں گھی کی

طرح جلتی ہے۔ عرفانی صاحب کو ان باتوں سے خوف تو لاحق ہوا لیکن کیا کرتے بیوی پورے دنوں سے تھیں اور سارے شہر میں کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ناچار تالا کھول کر گیلری ہی میں بیٹھ گئے ڈمپل اس وقت چھ سال کی تھی۔ سہیلا اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ اور مہ پارہ کی آمد تھی۔ اباجی کا کوئی کاروبار نہ تھا۔

امی کی چارپائی ڈرتے ڈرتے گیلری میں ڈال دی گئی۔ اور ساری رات آیۃ الکرسی پڑھتے نکلی۔ کسی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ کسی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانک بھی لیتا۔ لمبی گیلری میں زمستانی ہوائیں چلتی رہیں کیونکہ گیلری کے دونوں جانب دروازوں کے شیشے شکستہ رو تھے۔ امی دردِ زہ سے کراہ رہی تھیں۔ اور سردیوں کی ہوائیں اس کوٹھی کے دروازے کھڑکیوں پر انگلیاں بجا بجا کر کہہ رہی تھیں . . . رام نام ست ہے . . . رام نام ست ہے . . . جب بھی بجلی کڑکتی یوں لگتا جیسے اوپر والی منزل سے کسی نے زور سے سنکھ پھونکا ہو . . . کمروں میں دھوپ اور سامگری کی خوشبو اڑتی پھرتی تھی۔

اسی رات موم بتی کی روشنی میں مہ پارہ ان کے گھر آئی . . . اور اباجی نے اس کا ناڑو پھل کترنے والے گجراتی چاقو سے کاٹ کر باندھا۔ آنول باہر کے نلکے کے پاس چھوٹا سا گڑھا کھود کر جلدی جلدی دبائی . . . ان پر اس نئے ماحول کی کچھ ایسی دہشت طاری تھی کہ کفگیر سے اچھا سا گڑھا بھی نہ کھودا نہ جا سکا . . . اور صبح سویرے ایک کالا کتا اس آنول کو نکال کر ٹیوب ویل کے پاس لے جا کر بھنبھوڑنے لگا۔

سرد دھوپ کا دن بڑے آرام سے کروٹیں بدل بدل کر طلوع ہوا تو گھر کی صورت نظر آنے